

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادہ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

ڈاکٹر طہ حسین کی قرآن کے متعلق آرا

سوال: ڈاکٹر طہ حسین نے اپنی کتاب ”ادب جاہلی“ میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف املا، بلکہ گرامر کی غلطیاں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی ہرزہ سرائی کی ہے۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ (محمد عارف جان)

جواب: قرآن مجید میں املا وہی قائم رکھی گئی ہے جو صحابہ رضوان اللہ علیہم نے کی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی اسی حالت پر قائم رہے جس میں صحابہ رضوان اللہ علیہم نے اسے امت کو منتقل کیا تھا۔ بعد میں املا کے طریقے تبدیل ہو گئے۔ یہ تبدیلی کئی پہلوؤں سے ہوئی ہے۔ اس کی روشنی میں قرآن کی املا کو تبدیل کرنا ناموزوں ہے۔ اگر قرآن میں موجود املا کو کوئی شخص غلط کہتا ہے تو وہ موجودہ املا کے قواعد کی روشنی میں کہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ قرآن کے بارے میں یہ بات اس طرح کہنے کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ قرآن میں بعض جگہ پر املا جدید املا سے مختلف ہے۔ باقی رہا یہ دعویٰ کہ قرآن میں گرامر کی غلطیاں ہیں تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ قرآن گرامر کا تابع نہیں ہے۔ گرامر قرآن کے تابع ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ گرامر اہل زبان کے تعامل کو دیکھ کر مرتب کی جاتی ہے۔ اس میں

بعض قواعد ایسے بن جاتے ہیں جو اہل زبان کی بعض اختراعات کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ اس طرح کی صورت حال میں صحیح رویہ یہ نہیں کہ اہل زبان کی تحریر کو غلط قرار دیا جائے۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ گرامر کے اس قاعدے میں ضروری ترمیم کر دی جائے۔ خدا کا کلام ہر طرح کے نقص سے پاک ہے۔ ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ طہ حسین اور بعض مستشرقین کی اس طرح کی مثالیں ان کی کم علمی کا مظہر ہیں۔ ہمارے رفیق معز امجد صاحب نے اس طرح کی بعض مثالوں کا تجزیہ کر کے یہ حقیقت پوری طرح ثابت کر دی ہے۔

آزمائش اور بلند مراتب

سوال: مفتی شفیع صاحب سورہ انبیاء کی تفسیر میں حضرت ایوب علیہ السلام کے قصے کے ذیل میں ایک روایت نقل کرتے ہیں: 'اشد الناس بلاء الانبياء ثم الصالحون ثم الامثل فالامثل'۔ سوال یہ ہے کہ جس مومن پر سخت آزمائش نہیں آتی، اس کا مقام اللہ کے نزدیک بہت چھوٹا ہے؟ وضاحت فرمادیں۔ (وحدت یار)

جواب: اگر بڑی آزمائش یا سخت آزمائش کا مصداق صرف جسمانی تعذیب کو قرار دیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر یہ بات زیر بحث آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ دعویٰ ایمان کو آزمائشوں سے گزارتے ہیں، تاکہ دل کا کھوٹ یا ایمان کی کمزوری واضح ہو جائے اور کسی عذر کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ یہ آزمائشیں جسمانی بھی ہوتی ہیں اور نفسیاتی بھی، معاشی بھی ہوتی ہیں اور معاشرتی بھی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو طائف کے سفر میں بھی ایک ابتلا پیش آئی تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب تہمت لگی تو وہ بھی ایک ابتلا تھی۔ اگر آزمائش کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دونوں ایک ہی درجے کی ہیں۔ اسی طرح وہ آدمی جس کو غربت کی آزمائش نے ایمان کی بازی ہرا دی اور وہ جہنم میں چلا گیا اور وہ آدمی جس کی دولت نے ایمان کی بازی ہرا دی اور وہ دوزخ میں چلا گیا، آخرت کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو دونوں بڑی آزمائش سے گزرے۔ ہاں دنیا میں ہمیں دھوکا ہوتا ہے کہ دولت والے پر کوئی آزمائش نہیں آئی۔

حدیث میں جو بات بیان ہوئی ہے، وہ قرآن مجید کے بیان کردہ اصول آزمائش کا بیان ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ایمان کو پرکھتے ہیں تو اسی سطح پر پرکھتے ہیں جس سطح کا دعویٰ ہے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء جس سطح پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ

ہوتے ہیں، اسی سطح کے مطابق ان پر امتحان بھی آتے ہیں اور وہ ان امتحانات سے سرخ رونکتے ہیں۔ یہی معاملہ دوسرے نیک لوگوں کا بھی ہے۔ جو ان امتحانات میں کامیاب ہو جاتے ہیں، انھیں یقیناً اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوگا۔ لیکن یہ بات قیامت کے دن ظاہر ہوگی۔ دنیا میں بڑی تکلیف کا آنا لازماً بلند مرتبہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

آزمائش کی حکمت

سوال: قرآن کریم اور احادیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان پر آزمائش آنا دو علتوں پر مبنی ہے۔ ایک جب انسان مومن جادہ حق سے انحراف کر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تنبیہ کی خاطر آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ دوسری جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ کسی بندہ مومن کا درجہ اونچا کرے تو اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے جیسے انبیاء علیہم السلام کا حال ہے۔ براہ کرم اس موضوع پر قرآن کریم اور صحیح احادیث کی روشنی میں جواب دیں۔ (وحدت یار)

جواب: آزمائش کے دو پہلو ہیں۔ ایک آزمائش یہ کہ ہم جس ایمان کے مدعی ہیں، اس کی حقیقت اچھی طرح متعین ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ دین پر عمل کرتے ہوئے تزکیہ نفس کا جو سفر ہم نے شروع کیا ہے، وہ بھی تکمیل کو پہنچے۔ ہمارے اخلاق اور دین و ایمان پر استقامت ہر لمحے معرض امتحان میں رہتے ہیں۔ جب جب آزمائش آتی ہے اور یہ صبر اور شکر، دونوں پہلوؤں سے ہوتی ہے اور ہم اس میں کامیاب ہوتے رہتے ہیں تو یہ ہمارے ایمان میں ترقی کا زینہ بنتی چلی جاتی ہے۔ اس پہلو سے آپ کی بات درست ہے کہ یہ مومن کے لیے بلند درجے کے حصول کا ذریعہ ہے۔ آپ کی یہ بات بھی درست ہے کہ بعض تکلیفیں غفلت سے بیداری کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کا اظہار بھی ہیں کہ انھوں نے گرتے ہوئے شخص کو سنبھلنے کا ایک موقع فراہم کر دیا ہے۔ لیکن آزمائش کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جن میں ایک دو امور کی طرف اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر کے واقعات میں بھی ہوا ہے۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ یہ دنیا آزمائش کے لیے ہے۔ اس میں امتحان اور اس کے لوازم کی حیثیت سے ترغیب و ترہیب کے مراحل بھی پیش آتے ہیں۔ لیکن ہر واقعے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہمارے ادراک کے لیے ممکن نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سفر سے ایک یہ بات بھی واضح ہوتی ہے۔

بھولا اور سیانا مومن

سوال: احادیث میں ہے: 'المؤمن غر کریم ...' (مومن مہربان بھولا ہے...)، 'لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین ...' (مومن ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا...)، 'اتقوا فراسة المؤمن فإنه یری بنور ربہ ...' (مومن کی فراست سے بچو وہ اپنے رب کے نور سے دیکھتا ہے...)۔ بظاہر ان روایات میں تناقض ہے۔ ان روایتوں کو کس طرح جمع کریں گے؟ (وحدت یار)

جواب: دونوں باتوں کا محل الگ الگ ہے۔ شارحین نے بالکل صحیح بیان کیا ہے کہ اس سے فریب اور چالاکی کی نفی کی گئی ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ مومن سمجھ دار نہیں ہوتا۔ مومن خدا کے حضور جواب دہی کے احساس کے تحت فریب اور سازش جیسے مکروہ کاموں سے گریزاں رہتا ہے۔ دوسرے وہ حسن ظن اور خیر خواہی کے جذبے کے تحت خود غرضی اور موقع پرستی جیسے عوارض سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے رویے اور عمل میں ایک سادہ آدمی نظر آتا ہے۔ غالباً یہی بات ہے جس کے لیے 'غر کریم' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ دوسری روایتوں میں مومن کے سمجھ دار ہونے کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی سمجھ کا اعلیٰ ترین اظہار اخلاق کی درستی اور جذبات کے صحیح رخ پر استوار ہونے میں ہے۔ دین کی تعلیمات دل و دماغ میں اتر جائیں اور عمل اس کے مطابق ڈھل جائے تو وہ فراست حاصل ہو جاتی ہے جسے فراست مومن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ باقی رہے دنیا کے شر تو اللہ تعالیٰ ان سے حفاظت کا بندوبست ایسے صالحین کے لیے اپنی جناب سے کرتے رہتے ہیں۔

امریکہ سے جہاد

سوال: موجودہ ظروف و شرائط میں جہاد افغانستان برضد امریکا کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیا اس کو جہاد کہہ سکتے ہیں۔ کیا کسی خاص شرائط میں انفرادی جہاد جائز ہے۔ مثلاً کسی اسلامی ملک پر کافر یلغار کریں اور حکومت وقت بز دل ہو کر کفار سے ہم نوا ہو جائے۔ اس صورت حال میں دین کا تقاضا کیا ہے؟ (وحدت یار)

جواب: ہماری رائے میں حالات خواہ کچھ بھی ہوں، انفرادی جہاد جائز نہیں ہے۔ حکومت کا بز دل ہونا یا جہاد کی

ذمہ داری ادا نہ کرنا کسی مسلمان کو اس کا مکلف نہیں ٹھہراتا کہ وہ خود جہاد کرنے لگے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ حکومت کو اس کی ذمہ داری ادا کرنے پر آمادہ کرے اور جب تک حکومت آمادہ نہ ہو کوئی قدم آگے نہ بڑھائے۔ سیاسی گروہوں کی سیاسی جدوجہد دنیوی سیاست ہے۔ اسے خواہ مخواہ دینی عنوانات دینے سے صورت حال پیچیدہ ہوتی ہے۔ اسلامی جہاد صرف وہ ہے جو باقاعدہ حکومت کے تحت کسی ظلم کے استیصال کے لیے ہو یا مسلم وطن کے دفاع کے لیے کیا جائے۔ باقی رہی سیاسی جدوجہد تو اس کے لیے کسی کی جان لینا دین کی رو سے جائز نہیں۔ مزید براں امت مسلمہ کی حالت زار کے پیش نظر تدبیر کی سطح پر بھی یہ نقصان کا باعث ہے اور منزل دور سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

محتاجی سے بچنے کی دعا

سوال: میرے ہاتھ میں آپ کا رسالہ ماہنامہ ”اشراق“ ماہ جون ۲۰۰۶ء ہے۔ اس کے ٹائٹل پر درج ہے: ”اللہ تعالیٰ نے یہ نظام اس طرح قائم کیا ہے کہ یہاں سب لوگ ایک دوسرے کے محتاج اور محتاج الیہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔“ میں ہی نہیں، سب لوگ یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ کسی کا محتاج نہ کرے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم غلط دعا کرتے ہیں؟ (برگشت علی)

جواب: آپ کی دعا بالکل درست ہے۔ ہماری بھی دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کسی کا محتاج نہ کرے۔ آمین۔ محولہ عبارت میں جو محتاجی بیان ہوئی ہے، اس میں اور ہماری دعا کی محتاجی میں فرق ہے۔ ہم تو صحت اور اپنی کمائی کے جاری رہنے کی دعا کرتے ہیں۔ صحت اس لیے کہ ہم موت تک اپنے سارے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے ہوئے رخصت ہوں۔ کسی کی ذمہ داری نہ بن جائیں۔ اپنی کمائی اس لیے کہ ہمیں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلا نا پڑے۔ محولہ عبارت میں محتاجی سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی معیشت کا پہیہ چلانے کے لیے دونوں طرح کے لوگوں کی ضرورت ہے۔ ایک وہ جو سرمایہ فراہم کریں اور انتظام کریں اور دوسرے وہ جو ان کے لیے کام کریں۔ اس طرح لوگ مختلف خدمات انجام دیتے ہیں اور معیشت کی گاڑی رواں دواں رہتی ہے۔ غرض یہ کہ اس عبارت میں اس نوعیت کی خدمات کے لیے محتاج اور محتاج الیہ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

قومی بچت سرٹیفکیٹ

سوال: عمر کے ساتھ ساتھ میرے سب جوڑ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ میں صرف ۲۴۰۰ روپے پنشن حاصل کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف ۸۱ سال ہے۔ بے کاری کی مدت بھی تقریباً چھ سال ہو گئی ہے۔ اب پنشن ۳۰۰۰ روپے ملتی ہے۔ جو اس زمانے میں گزارے کے لیے ناکافی ہے۔ مزید یہ کہ کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ میں نے اپنی رقم سے جو رکھے رکھے کم سے کم ہوتی جا رہی تھی، قومی بچت کے دفتر سے سرٹیفکیٹس بہبود اسکیم لے لیے ہیں۔ ان سے بھی تقریباً ۳۰۰۰ روپے مل جاتے ہیں۔ اس طرح چھ ہزار روپے سے کچھ گزارہ ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ کاروبار میں لگا دوں تو آپ کے علم میں ہوگا کہ قرآن چھاپنے والے ادارے بھی لوگوں کے پیسے ہضم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سرٹیفکیٹ کی آمدنی حرام ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟

جواب: سرٹیفکیٹ سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے، وہ سود کی آمدنی ہے۔ حکومت نے عوام سے قرضہ لینے کے لیے یہ اسکیم بنائی ہوئی ہے۔ حکومت اس قرض پر عوام کو سود ادا کرتی ہے۔ آپ نے جیسے اپنے حالات لکھے ہیں، ان میں آپ کو کوئی دوسرا مشورہ دینا مشکل ہے۔ بہر حال، اگر آپ اپنے آپ کو اس معاملے میں معذور سمجھتے ہیں اور آپ کے لیے کوئی اور چارہ کار نہیں ہے تو آپ اس آمدنی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ آپ کے عذر کے پیش نظر آپ کے اس معاملے سے درگزر فرمائیں گے۔ لیکن یہ فیصلہ آپ ہی نے کرنا ہے کہ آپ معذور ہیں اور آپ کو یہ روپے لے لینے چاہئیں۔

آپ کا سوال یہی تھا، جو میں نے اوپر نقل کر دیا ہے۔ باقی آپ نے ان لوگوں کی مثالیں دی ہیں جو لوگوں کے ساتھ دھوکا اور فریب کر کے انھیں لوٹ رہے ہیں۔ آپ یہ مثالیں دے کر اپنا یہ خیال موکد کرتے ہیں کہ سرٹیفکیٹ کی آمدنی لینا، اس طرح لوگوں کو لوٹنے سے بہتر ہے۔ دیکھیے، جس طرح ان لوگوں کی آمدنی حرام ہے، اسی طرح سود کی آمدنی بھی حرام ہے۔ صورت واقعہ کے پہلو سے اگر کچھ فرق ہے تو وہ اس کو جائز نہیں بنا سکتا۔ ہاں، ایک معذور آدمی کے نقطہ نظر سے آپ کا اسے ترجیح دینا سمجھ میں آتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر پر اشکال

سوال: قرآن مجید میں آتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال دعوت و تبلیغ کا کام کیا۔ اب تک میرا خیال تھا کہ انسان کی اوسط زندگی اور قد کا ٹھ ایک جیسا ہی ہے۔ دو چار انچ یا پانچ دس سال کا فرق تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن روایات میں عوج بن عنق کے قد کا ٹھ کے بارے میں جس طرح مبالغہ آرائی پائی جاتی ہے، وہ حقیقت نظر نہیں آتی۔ چونکہ ان کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، اس لیے ہم آسانی سے اس کی تردید کر سکتے ہیں۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی ۹۵۰ سال تبلیغ کا ذکر قرآن مجید میں ہے جس کو ہم کسی صورت نہیں جھٹلا سکتے۔ کیا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے تمام افراد کی عمریں اتنی ہی تھیں؟ اس قوم کے قد کا ٹھ ہمارے جیسے تھے یا ان کی نوعیت کچھ اور تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ اب سے چار پانچ ہزار سال پہلے بتاتے ہیں۔ چار پانچ ہزار سال انسانی تاریخ میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ یہ بات کسی طور سمجھ میں نہیں آتی کہ صرف چار ہزار سال پہلے کسی کی عمر ہزار سال ہو۔ قرآن سے کسی اور پیغمبر کے بارے میں اس طرح کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ (محمد عارف جان)

جواب: حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ قبل تاریخ کا زمانہ ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ بائبل میں دیے گئے شجرہ نسب سے حضرت آدم اور حضرت نوح وغیرہ کے زمانے کا اندازہ لگانا درست نہیں ہے۔ اس شجرہ نسب میں وہی نام باقی رہ گئے ہیں جو بہت معروف ہو گئے تھے اور بیچ کی کئی نسلیں غائب ہیں۔ ان کے خیال میں یہ درحقیقت بڑے بڑے سرداروں کے نام ہیں۔ ایک اور دوسرے شخص کے بیچ میں ممکن ہے، کئی سو برس کا فاصلہ ہو۔ ان کی اس رائے کو سامنے رکھیں جو واضح طور پر درست لگتی ہے تو حضرت نوح کے زمانے کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنا ممکن نہیں۔ البتہ اگر کوئی خارجی شواہد موجود ہوتے تو ہمیں کوئی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ لیکن حضرت نوح کے حوالے سے ایسے کوئی شواہد میرے علم کی حد تک ابھی تک نہیں ملے۔

اب ہمارے پاس واحد یقینی ذریعہ قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید میں بھی صرف حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ہی کا ذکر ہے۔ کوئی اور بات اس زمانے کے انسانوں کے حوالے سے مذکور نہیں ہے۔ بائبل کتاب پیدائش کے باب ۵ اور ۶ میں جو تفصیل منقول ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لمبی عمروں کا یہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ختم کر دیا گیا۔ قرآن مجید کے بیان کی روشنی میں ہم یہ اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کہ بائبل کا یہ بیان درست ہو۔ لیکن یقینی

رائے کے لیے سائنسی شواہد کی دستیابی ضروری ہے، البتہ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کا بیان حتمی ہے اور ان کے بارے میں ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی عمر یہی تھی۔

یہ سوال کہ اس زمانے کے لوگوں کے قد کاٹھ کیا تھے، اس کا واحد ماخذ اسرائیلی روایات ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس سلسلے میں جو کچھ مروی ہے، وہ انھی روایات سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ لہذا اس باب میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ جو خارجی شواہد ابھی تک سامنے آئے ہیں، ان سے تو قد کاٹھ کے بارے میں ان بیانات کی تائید نہیں ہوتی۔ لیکن قبل تاریخ کے انسان کے بارے میں ان تصورات کی قطعی تردید بھی شاید ابھی ممکن نہیں ہے۔

معلوم تاریخ کے انسان کی عمر اور قد کاٹھ کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آج کے انسان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ خارجی شواہد یعنی عمارتیں اور دوسرے آثار سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن کیا اس کی روشنی میں ہم قرآن کے بیان کی نفی کر سکتے ہیں۔ یقیناً اس نفی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن کے بیان کو ماننے کے بعد ہم یہ اندازہ بھی قائم کر سکتے ہیں کہ ان کے زمانے میں عام عمریں بھی ایسی ہی تھیں۔ اس اندازے کی تائید بائبل کے بیان سے بھی ہوتی ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کو ایک مجوزہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ باقی رہا قد کاٹھ تو اس باب میں کوئی یقینی بات ہمارے پاس نہیں ہے۔ خارجی شواہد کی روشنی میں ہم ان اسرائیلی روایات کو رد بھی کر سکتے ہیں۔